پیش رو

سمندر کی موجیں جوار بھاٹا کے بعد اتر رہی تھیں۔ کہیں ریت
چمکنے لگا۔ اور میں نے نیچے جھک کر ریت پر ایک سطر تحریر کی
جس میں میں نے اپنے تخیلات کی ترجمانی کی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

پھر جب موجیں بلند ہوئیں تو میں اسی کنارے کی طرف لوٹا
اور جو کچھ میں نے ریت پر لکھا تھا۔ وہ مٹ چکا تھا۔ مگر وہاں
کسی اندھے کی لاٹھی کے نشان موجود تھے۔

Pesh Rau

پیش رو

جبران خلیل جبران

بشیر ہندی

جملہ حقوق دائمی بحق سید عزیز ہندی محفوظ

اردو محل لاہور

قیمت

عہ

اردو محل لاہور

قیمت
عہ

بشیر مہدی کی دوسری کتابیں

پاگل ———

انگارے ———

ارضی دیوتا ———

عالم برزخ ———

مندرجات

دیباچہ اوّل

جبران خلیل جبران، سرزمین شام کا وہ آتش نفس ادیب، وہ شیریں نوا شاعر اور وہ سحر کار مصوّر تھا، جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ع

بگذشت حیّتِ فضل و کمالش ز بحر و بر

کرۂ ارض کا کوئی متمدّن گوشہ ایسا نہیں ہے، جہاں اُس کے طلسمی نغمے "فردوش گوش" نہ ہوئے ہوں، اور دُنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں ہے جس نے اپنے دامن ادب کو اس کے فلک پیما افکار سے مالا مال نہ کیا ہو۔ یہ اُردو کی خوش قسمتی ہے کہ جبران کی تقریباً ساری کتابیں اس میں منتقل ہو چکی ہیں اور وہ اس نامور فنکار کی عزت و تکریم میں دنیا کی کسی زبان سے پیچھے نہیں ہے۔

اس سے پہلے کہ میں جبران کے متعلق کچھ عرض کروں مناسب معلوم ہوتا

ہے کہ اس کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ رہے۔ کہ اس کے فن نے کہاں اور کن حالات میں ترقی کی؟

جبران ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا۔ مقام پیدائش بشری (لبنان) ہے ابتدائی زندگی لبنان کی شاعرانہ فضا میں گزری۔ بارہ برس کا ہوا، تو امریکہ چلا گیا۔ چند سال وہاں قیام کیا اور اس کے بعد عربی زبان کی تحصیل کے لئے بیروت آکر مدرسۂ حکمت میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۰۳ء میں امریکہ واپس ہوا، اور پانچ سال تک وہیں رہا۔ اس عرصہ میں اس کا قیام زیادہ تر بوسٹن میں رہا جہاں اُس نے عربی میں کچھ کتابیں لکھیں۔ ۱۹۰۸ء میں مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیرس کا سفر کیا حصولِ مقصد کے بعد یورپ کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی ۱۹۱۲ء میں امریکہ واپس آگیا، اور نیویارک میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اس کی انگریزی مؤلفات اور بعض عربی تصنیفات اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۳۱ء میں موٹر کے حادثہ میں بُری طرح زخمی ہوا، اور دو تین روز کے بعد ہسپتال ہی میں اپنے "مرکزِ اصلی" کی طرف لوٹ گیا۔

جیسا کہ جبران کی زندگی کے اس خاکہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ امریکہ میں بسر ہوا، وہیں اس کے افکار میں پختگی پیدا ہوئی اور وہیں اُس نے تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ وہ شامی نہیں امریکی تھا تو حقیقت سے زیادہ بعید نہ ہوگا۔ لیکن مشرقیت اس کی رگ و پے میں اس درجہ جاری و ساری تھی اور لبنان کی محبت اس پر اس قدر غالب کہ پیرس کی ہوشربا تفریح گاہوں میں بھی لبنان کی حسین و جمیل وادیاں اس کی چشم تصوّر سے اوجھل نہ ہوتی تھیں اور نیو یارک کے وسیع و عریض بازاروں اور بلند و بالا عمارتوں میں بھی اُسے شام کے دیہات اور اُن کی جھونپڑیاں نظر آتی تھیں۔ اس کا جسم مغربی تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن اس کی روح سر تا سر مشرقی تھی۔ اپنے وطن کی محبت میں وہ اتنا سرشار تھا کہ تقریباً اپنے ہر مضمون اور افسانے میں لبنان کا ذکر والہانہ انداز میں کرتا ہے۔ شام کی سرزمین، جو دنیا کے بڑے بڑے پیغمبروں اور جلیل القدر بادشاہوں کا مولد و مسکن ہے۔ اُسے اس عالم خاک و باد کے ہر حصہ سے زیادہ پیاری ہے وہاں اسے عظمت رفتہ کے نغمے گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہیں سرگوشیاں کرتی نظر

آتی ہیں اور حسن و محبت ہمکنار و ہم آغوش ہوتے دکھائی دیتے ہیں اُس کے نزدیک شام کی بہار حسن و دلکشی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی چنانچہ جب کبھی وہ اس کی تصویر کھینچتا ہے فکر میں بلا کی شعریت اور قلم میں قیامت کا زور پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ٹکڑا اسی کی زبان میں مع ترجمہ کے ملاحظہ فرمائیے:۔

الربیع جمیل فی کل مکان	یوں ہونے کو تو بہار ہر جگہ حسین ہوتی
ولکنہ اکثر من جمیل فی سوریا	ہے لیکن شام میں اس کا حسن اور
الربیع روح اللہ غیر معروف	بھی نکھر جاتا ہے ...... بہار انجان
تتطوف فی الارض مسرعۃ	خدا کی روح ہے، جو نہایت تیزی سے
وعند ما تبلغ سوریا تسیر	زمین کا طواف کرتی ہے، لیکن جب
بیطء متلفتۃ الی الوراء۔	شام میں پہنچتی ہے تو اپنی رفتار سست
	کر دیتی ہے اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے

اسی سلسلہ میں تشبیہ کی لطافت و پاکیزگی دیکھئے:۔

ویبرودت فی الربیع اجمل سنھانی ما	اور تمام موسموں کے مقابلہ میں بیروت
بقی من الفصول لانھا تخلو فیہ من	بہار میں زیادہ حسین ہوتا ہے اس لئے

او حال الشتاء وغبار الصيف — کہ جاڑوں کے کیچڑ پانی اور گرمیوں کے گرد وغبار
ولقبح بين اعطار الاول و — سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ جاڑے کی
حرارة الثاني لتضبية حسناء — مہاوٹوں اور گرمی کی دھوپ کے درمیانی موسم
قد اغتسلت بمياه الغدير — میں وہ اس حسین دوشیزہ کی مثال ہو جاتا ہے
ثم جلست على ضفته بجفف — جو نہر میں نہا کر اس کے کنارے بیٹھی، سورج
جسدها باشعة الشمس۔ — کی شعاعوں سے اپنا جسم خشک کر رہی ہے

اسی طرح متعدد مقامات پر اس نے لبنان اور اس کی شعر آفرین وادیوں کا ذکر نہایت حسین اسلوب میں کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لبنان اس کے جسمانی و روحانی سکون کا واحد مرکز ہے۔

مشرق کے متعلق جبران نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن میں ہمدردی و دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ مشرق سے محبت ضرور کرتا ہے لیکن اس کی محبت اندھی اور بہری محبت نہیں ہے جو چاہنے اور چاہے جانیوالے دونوں کے لئے تباہ کن ہوتی ہے، اس کے برخلاف اس کی محبت میں مشرق کی پستی و زبوں حالی کا المناک احساس نہایت شدت سے کار فرما ہے۔ وُہ اہلِ مشرق کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتا جو محبت کے جاہلانہ تصور کا نتیجہ ہے، بلکہ انہیں کھول کر بیان کرتا ہے۔ اُن کے اسباب و علل کی چھان

بین کرتا ہے اور مشرقی اقوام کو اُن کی تباہ حالی پر لعن طعن کرنے سے کبھی نہیں چوکتا جتنی جتنی اہلِ مشرق کی غفلت و بے پروائی بڑھتی جاتی ہے۔ اتنی اتنی اس کی آواز میں تلخی اور کرختگی پیدا ہوتی جاتی ہے ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!
حدی را تیز ترمی راں چو محمل را گراں بینی!

اور جب اہلِ مشرق اس کے ان خیالات کی تاب نہ لا کر اس پر کافر، ملحد اور انتہا پسند ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں، تو وہ صاف صاف کہتا ہے:۔

"ہاں! میں انتہا پسند ہوں اور اس لئے ہوں کہ جو کوئی اظہارِ حق میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ حق کے محض نصف حصہ کو بیان کرتا اور نصف آخر لوگوں کی بدگمانیوں اور خیال آرائیوں کے خوف میں چھپا رہ جاتا ہے!"

جب مشرق کے دعویداران تہذیب و اخلاق اور حاملانِ فکر و نظر اس کے متعلق کہتے ہیں کہ "وہ انتہا پسند ہے اور زندگی کا تاریک رُخ ہی اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مدت سے ہم پر نالہ و ماتم اور ہماری تباہ حالی پر آہ و فغاں کر رہا ہے!" تو وہ جواب دیتا ہے:

ہاں! میں مشرق پر ماتم کرتا ہوں، اس لئے کہ لاش کے سامنے ناچنا

خطرناک قسم کی دیوانگی ہے۔ ہاں! میں اہل مشرق پر روتا ہوں اس لئے کہ بیماریوں پر ہنسنا جہل مرکب ہے۔ ہاں! میں مشرق کے پیارے ملکوں کا مرثیہ پڑھتا ہوں۔ اس لئے کہ اندھی مصیبت کے سامنے گانا اندھی جہالت ہے!"

مشرق کی تباہی کے ذمہ دار جبران کی نگاہ میں مذہبی پیشوا اور امرائے سلطنت ہیں، چنانچہ جہاں کہیں اسے موقع ملتا ہے وہ کہانت کے بُت پر ضرب لگائے بغیر نہیں رہتا' پادری کا نام آتے ہی اس کے خون میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس کی مکاریوں اور چالبازیوں کو اس طرح بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، گویا اس کی تخلیق کی غایت ہی کہانت کا استیصال ہے۔ اس کی رائے میں کہانت وہ پیشہ ہے جسے انسان نے بغیر کسی طبعی ضرورت کے ایجاد کیا ہے۔"

امرائے سلطنت کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ غریبوں کا خون چوسنے اور ان کی ہڈیوں پر اپنے محل تیار کرنے میں بڑے چابکدست ہیں مشرق چونکہ ہمیشہ سے اوہام و تقالید کی تاریکیوں میں محبوس ہے اس لئے دولت و قوت کے دیوتا' پادریوں کی مدد سے مزدوروں اور کسانوں پر اپنا اقتدار قائم رکھتے ہیں اور انہیں اپنی خواہشوں پر قربان کر کے انسانیت کا

کا گلا گھونٹتے ہیں۔ اپنے ایک طویل افسانے "الخلیل الکافر" میں جبران نے اپنے ان تصورات کا اظہار بڑی جرأت و بیباکی سے کیا ہے اور یہیں سے اس کے خیالات کے ڈانڈے اشتراکیت سے ملتے ہیں۔

اسی ضمن میں وہ مشرقی شاعروں اور ادیبوں کو بھی لتاڑتا ہے کہ وہ عزتِ نفس کھو کر امیروں اور حاکموں کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتے ہیں۔ حالانکہ قوم کی رہبری اور اصلاح اُن کا اوّلین فرض ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہیں کہہ چکا ہوں۔ جبراؔن گو ساری عمر امریکہ میں رہا لیکن مشرق کی محبّت اس کے رونگٹے رونگٹے میں کارفرما تھی۔ یورپ اور امریکہ کی مادی ہنگامہ آرائیاں اس کی روحانیت کو فنا نہ کر سکیں۔ وہ عیسائی تھا اور کٹر قسم کا عیسائی۔ حضرت مسیحؑ سے اُسے والہانہ شیفتگی تھی، اور وہ مسیحی تعلیمات کی رُوح کو سمجھتا تھا، پادریوں اور راہبوں کی ذاتی اغراض نے مسیحیت پر جو تہ بہ تہ پردے ڈال رکھے ہیں، اس کی نگاہ حقیقت شناس نے اُن سب کو ایک ایک کرکے چاک کر دیا تھا، اسی لئے جہاں کہیں اس نے مسیحیت پر اظہارِ خیال کیا ہے اپنی تمام تر عقیدتوں کے باوجود اس دردناک حقیقت کا رونا بھی رویا ہے کہ مسیحیت کو غرض کے بندوں نے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس

نے گو صاف طور پر کہیں نہیں لکھا لیکن اس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیٹشے کا "فوق البشر" (SUPER MAN) مسیحؑ کے روپ میں تھا ایک بڑے مفکر کی طرح وہ دنیا کے ہر مصلح اور پیغمبر کا ذکر احترام سے کرتا ہے لیکن جہاں مسیحؑ کا ذکر آتا ہے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں دماغ کے ساتھ دل بھی شامل ہے

جہاں تک جبران کے روحانی ہونے کا تعلق ہے، مجھے اس پر مطلقاً حیرت نہیں کہ اس کا خمیر ہی اس آب و گل سے تیار ہوا تھا جس کے ایک ایک قطرے اور ایک ایک ذرے میں روحانیت رچی ہوئی تھی۔ البتہ اس بات پر سخت تعجب ہے کہ وہ "تناسخ" کا قائل تھا چنانچہ اس نے اپنے دو[۲] افسانوں "رماد الاجیال والنار الخالدہ" اور "الشاعر البعلبکی" کی بنیاد ہی اس نظریہ پر رکھی ہے معلوم نہیں کیا سمجھ کر اُس نے اس فلسفہ کو قبول کیا ہے، جسے ہندوستان کے علاوہ اور کسی ملک میں کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کا اُس نے براہِ راست مطالعہ کیا ہو اور اس فلسفہ میں اپنے نزدیک کوئی راحت محسوس کر کے اسے قبول کر لیا ہو، بہر حال اس کی صحیح وجہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، وہ جبران کے چند موضوعات کا سرسری مطالعہ ہے، اب رہ جاتا ہے اس کا طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان، سو اس کے لئے میری رائے میں یہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ صاحبِ طرز (Stglist) تھا فلسفہ و نفسیات کے مسائل اس نے ایسے دلنشین انداز میں بیان کئے ہیں کہ وجدان رقص کرنے لگتا ہے اور لطافتِ مذاق جھوم جھوم جاتی ہے۔

ایک اور ضروری بات جو کہنے سے رہی جاتی ہے، یہ ہے کہ ہندوستان میں جبران کی شہرت ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ حالانکہ میری رائے میں جبران سب کچھ ہے، مگر افسانہ نگار نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے چند افسانے لکھے ہیں، لیکن صرف اس لئے کہ اپنے افکار کو زیادہ عام کرنا چاہتا تھا، یا یوں کہہ لیجئے کہ اس نے اپنے افکار کی کونین پر افسانے کی شکر کا غلاف چڑھا کر پیش کیا ہے۔ ورنہ پس منظر اور مکالموں سے قطع نظر، اس کے افسانوں میں پلاٹ ہے نہ ارتقاء، تجربہ ہے نہ منتہیٰ۔ وہ صرف ایک مفکر تھا اور شاعر، اس لئے سخت غلطی ہوگی اور جبران کی توہین بھی، اگر ہم اسے افسانہ نگار کہیں۔

آخر میں مجھے اس ترجمہ کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے جس کے لئے یہ سطور

سپرد قلم کی گئی ہیں۔ پیش نظر کتاب (پیش رو) جبران کی ایک انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب افسوس ہے کہ میری نظر سے نہیں گزری لیکن اس کا عربی ترجمہ جو الارشمندریت بشیر نے جبران کی زندگی ہی میں "السابق" کے نام سے کیا تھا میں نے دیکھا ہے اور اس کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ سید بشیر ہندی صاحب نے، جو اس سے پہلے جبران کی دو تصنیفات "المجنون" اور "آلہتہ الارض" کا کامیاب ترجمہ "پاگل" اور "ارضی دیوتا" کے نام سے کر چکے ہیں اور جنہیں میری طرح جبران سے بے انتہا عقیدت ہے، نہایت صحیح اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ ہندی صاحب نے جبران کو پڑھا ہے اور پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے ترجمے اصل سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

ہندی صاحب کی اس کوشش پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اس مفید خدمت کے لئے وقت نکالتے رہیں گے

حبیب اشعر

۱۵ رمئی ۱۹۴۶ء

ادبِ عربی میں جبران خلیل جبران ایک صاحبِ طرز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پیدائش ایسے زمانہ میں ہوئی جب عربی ادب پر قدامت پرستی کے پردے تہہ بہ تہہ چڑھے ہوئے تھے۔ ہر ادیب پرانی لکیر کا فقیر بن کر وہی کہتا جو اس کے پیشروؤں نے کہا۔ پرانے طرزِ تحریر اور قدیم تخیل کے خلاف ایک لفظ لکھنا بہت مشکل کام تھا۔ ایسے ماحول میں پرورش پا کر پھر انہیں پردوں کو چاک کر دینا جبران ہی کا کام تھا۔

جبران ۱۸۸۳ء میں لبنان میں پیدا ہوا۔ اسے فطرت کی طرف سے ذوقِ سلیم ودیعت کیا گیا تھا۔ بچپن ہی سے اسے ادب اور مصوّری سے شغف رہا۔ دس برس کی عمر میں —— اس عمر میں جب بچوں کا سب سے بڑا کام کھیل کود ہی ہوا کرتا ہے —— جبران دیگر ضروریات سے فراغت پاتا تو

کتب بینی یا اپنی کتابوں کو مختلف تصویروں سے آراستہ کرنے میں لگ جاتا۔
قدرت نے اسے موقع دیا اور عمر کے اس ابتدائی حصہ میں وہ روس فرانس
اور امریکہ گیا جہاں اس نے بدلی ہوئی دنیا کے بدلے ہوئے حالات اپنی
آنکھوں سے دیکھے۔ وہ اس ترقی یافتہ ماحول میں دو برس تک رہا۔ اور
بے چین طبیعت جس میں جوش اور ولولہ بھرا ہوا تھا لے کر واپس اپنے وطن
پہنچا۔ وطن میں ایک مشہور ادبی درسگاہ میں داخل ہوا۔ یہاں رہتے ہوئے
وہ مصوری کی مشق میں بھی لگا رہا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مصوری کے شوق نے
اسے دوبارہ پیرس کی راہ دکھائی۔ کچھ عرصہ پیرس میں رہ کر وہ پھر امریکہ
گیا۔ امریکہ (بوسٹن) میں بہت ہی کم عرصہ گزرا تھا جب اسے محسوس ہوا
کہ مصوری کے فن میں اس نے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ چنانچہ مزید ترقی
کے لئے وہ پیرس واپس آیا اور اس مرتبہ تین برس گزار کر پیرس کے
کہنہ مشق استادوں کی صف میں اپنے آپ کو لا کھڑا کیا۔ فن کی تکمیل ہو
چکی اب فن کو ترقی دینے کے لئے اس کی نظرِ انتخاب نیویارک پر پڑی۔
اور عمر کا بقیہ حصہ نیویارک ہی میں گزارنے کا ارادہ کر کے وہاں چلا گیا اور
قیام پذیر ہوا۔ اس کی باقی تمام عمر نیویارک میں گزری۔ درمیان میں کبھی

کبھی وطن کی یاد اسے وطن لیجانے پر مجبور تو کر دیتی لیکن اس ماحول میں زندگی گزارنا اس کی طبیعت کے خلاف تھا۔ اس لئے اس نے امریکہ ہی کو اپنا وطن بنایا۔ اور آخر ۱۹۳۱ء میں یہیں پر وفات پائی۔

جبران کے مضامین بہ یک وقت عربی اور انگریزی زبانوں میں قبولیت عامہ حاصل کر چکے تھے جس طرح عربی زبان کے جاننے والے بے چینی سے اس کے نئے مضامین کا انتظار کرتے اسی طرح انگریزی دان اس بات کے منتظر رہتے کہ جبران کی کوئی نئی چیز ان کے سامنے آئے وہ نظم و نثر دونوں کا نہ صرف ماہر بلکہ ایک طرز کا موجد تھا۔

اس کے مضامین کی خصوصیت یہ ہے اور وہ ہر مضمون میں یہ کوشش کرتا ہے کہ انسان کو خود اعتمادی کا درس دے اور اسے تصور کی دنیا میں ایسے بلند مقام پر پہنچادے۔ جہاں وہ دنیا کی ہر چیز سے اپنے آپ کو بلند و بالا سمجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا۔

جبران خاص طور پر دو چیزوں کے خلاف لکھتا رہا۔ سرمایہ پرستی اور قدامت پرستی ــــ سرمایہ پرستی کے بت کو توڑنا اور قدامت پرستی کے پھپھولوں کو چاک کرنا ہی اس کا منتہائے نظر تھا۔

جبران کی ایک اور خصوصیت جو ہمارے لئے عبرت کی راہیں کھولتی ہے یہ ہے کہ اس کی زندگی کا اکثر حصہ مغرب میں گزرا پھر وہ مغربی تہذیب اور اس کے اثرات کے خلاف لکھتا رہا۔ اس نے اپنے ہموطنوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی وُہ لکھتا ہے :-

"تم بڑے سخت ہو نہایت فصیح و بلیغ ہو آپس میں، ایکدوسرے کے مقابلہ پر، لیکن فرنگیوں کے سامنے کمزور اور گونگے۔ تم آزاد اور مصلح ہو لیکن صرف اپنی سٹیجوں پر اور اپنے اخبارات میں۔ اور مغرب کے باشندوں کے سامنے فرمانبردار اور رجعت پسند"

سرمایہ پرستی کے خلاف اپنے لبنانی بھائیوں کو مخاطب کر کے وہ کہتا ہے!

"تم وہی ہو جو بھوک سے اس وقت واقف ہوتے ہو جب خود تمہاری جیبیں خالی ہوں۔ مگر جب تم ایسے لوگوں سے ملتے ہو جو بھوک کے مارے جاں بلب ہوں تو تم ان پر ہنستے ہو اور منہ پھیر کر کہتے ہو یہ صرف بناوٹ ہے"

ادب میں قدامت پرستی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور کہتا ہے:-

"ادب پوری قوم اور اس کی ہیئت کل میں قوتِ تجدید کے آثار میں سے ایک نشانی ہے۔ جب تجدید کی قوت کمزور ہو جائیگی تو ادب بھی اس کے ساتھ ہی اپنے مقام پر ٹھہر جائیگا۔ ٹھہرنے کے ساتھ ہی اس میں رجعت پیدا ہوگی اور رجعت کے ساتھ اس کی موت اور اس کا مٹ جانا ضروری اور لازمی ہے۔"

اگر اسی طرح اقتباسات پیش کئے جائیں تو مقدمہ بجائے خود ایک کتاب کی صورت اختیار کر لیگا۔ اس لئے کہ اس کے مضامین کی ہر سطر اس قابل ہے کہ اسے اقتباس میں پیش کیا جائے، وہ ہر ہر لفظ میں مسائل حیات اور حقیقی واقعات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے بدنصیبی ہوتی اگر لبنان کے اس مفکر کے خیالات سے ہندوستان کی دنیا محروم رہ جاتی مشرقی ممالک کی تہذیب ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے اور مغربی تہذیب سے مختلف ہے۔ اہلِ مشرق کے لئے افادی ادب وہی ہو سکتا ہے جو مشرق کے ماحول کا اندازہ کر کے پیش کیا گیا ہو۔ اس لئے

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عربی فارسی کے ادیبوں کی بلند پایہ تصانیف
کو اُردو کا جامہ پہنائیں۔ جناب بشیر مہندی تمام اُردو دان طبقہ کے شکریہ
کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے جبران کے ایک اور شاہکار کو اُردو کا جامہ
پہنایا۔ بشیر صاحب کو جبران سے ایک ایسا تعلق پیدا ہو گیا ہے جو
عشق کے درجہ تک جا پہنچا ہے وہ ہر وقت جبران ہی کے خیال میں محو رہتے
ہیں۔ اور اس کے شاہکار دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔

ان کے اس ترجمے کی خوبی پڑھنے والے پر خود بخود ظاہر ہو گی۔
اس وجہ سے اس کے متعلق کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

عبد السبوح قاسمی

لاہور
۲۸ مئی ۴۶ء

جبران خلیل جبران ایشیا میں نفسیات انسانی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کی تصنیفات میں جن کا ترجمہ یورپ اور ایشیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انسانی فطرت کی عمیق ترین حسیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ وہ ایک ادیب، فلاسفر اور مصنّف کی حیثیت سے اتنا بلند مرتبت انسان ہے کہ اس کی موت پر امریکہ کے ایک مشہور اخبار نے لکھا۔ "آج امریکن اور عربی ثقافت کی ایک بہت بڑی شخصیت اس جہاں سے اٹھ گئی ہے"

جبران لبنان کے قصبہ بشری میں آج سے ۶۳ سال پہلے لبنانی والدین کے گھر پیدا ہوا۔ اس کے عادات و خصائل عام انسانوں سے بالکل مختلف تھے۔ ہر چند اس کا رابطہ گداگروں سے لے کر شاہوں تک قائم تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ہمیشہ تنہائی کی زندگی بسر کی عوام

سے خواص تک اس کے رابطہ کا نتیجہ یہ تھا کہ اسے ہر طبقہ کے انسانوں کے جذبات و احساسات، عقائد و رجحانات کا بسیط مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے اپنے حقیقت نگار قلم سے فطرتِ انسانی کی ایسی دلکش تصویریں کھینچیں۔ کہ اس کی عالمگیر شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

وہ مصور بھی تھا۔ لبنان کو چھوڑ کر اس نے نیویارک (امریکہ) میں اقامت اختیار کر لی۔ اور مصوری کو ذریعہ معاش بنایا۔ فرصت کے وقت اس کا مشغلہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف تھا۔ اس کے موقلم کے شاہکار تو ہمارے سامنے نہیں آئے۔ البتہ اُس کی کلک گہر بار نے ایسا اسلوبِ تحریر پیدا کیا۔ جو ترقی پسند مصنفین کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

مذہب کے لحاظ سے جبران خلیل جبران عیسائی تھا۔ اور اس نے اپنے فلسفیانہ رنگ میں مسیحیت کی تبلیغ کی۔ بعض لوگ اسے اشتراکی سمجھتے ہیں لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ وہ مسیحیت کا فلسفی مبلغ تھا۔ جیسا کہ اس کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔ وہ مسیحؑ کی زندگی سے بہت متاثر ہوا۔ مسیحؑ کی مصلوبیت نے اسے قنوطی بنا دیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ کہ "میں ایک جلا وطن ہوں پردیسی ہوں۔ اجنبی ہوں"۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جبران تناسخ کا بھی قائل تھا۔ اس کا قول ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے پیش رو رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے"......

پھر لکھتا ہے کہ "میری پہلی پیدائش پر سات ہزار سال گزر چکے ہیں"....

وہ دنیا بھر کے مذہبی پیشواؤں اور منصفوں کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھتا ہے۔ لکھتا ہے "مجھے تمام اہل مشرق میں کوئی ایک انصاف پسند عامل شرع راست رو حاکم بتائیے۔ مجھے کوئی مذہبی پیشوا دکھائیے۔ جو اپنے علم کے ساتھ عمل بھی کرتا ہو"

جبران ایک انتہا پسند انسان تھا۔ اور تعمیر کی بہ نسبت تخریب کا زیادہ قائل۔ چنانچہ ایک نقاد کے اس اعتراض پر کہ جبران اپنے انتہا پسندانہ خیالات میں جنوں کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ جبران نے کہا "کہ میرے متعلق بعض لوگوں کی یہ رائے ٹھیک ہے۔ فی الواقعہ میری انتہا پسندی جنون کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ میں تعمیر کی بہ نسبت تخریب کے زیادہ درپے ہوں۔ میرا دل ان چیزوں سے متنفر ہے۔ جن کی لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ اور میرے دل میں ان چیزوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جن سے تمام لوگ متنفر ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا۔ تو میں انسانی جماعت کے خیالات معتقدات

اور تقلیدات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا۔" پھر لکھتا ہے:-

"میں یہ نہیں چاہتا کہ آہ و بکا شیون و شیون کو لوگوں کے قہقہوں کے عوض بیچ دوں اور نہ ہی میری یہ خواہش ہے کہ میں ان کی مسکراہٹوں کو آنسوؤں میں بدل دوں میں تو چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے چہرے سے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو نوچ کر انکے سامنے بکھیر دوں۔ ان آنسوؤں کو جو میرے دل کو پاک کرتے ہیں۔ اور مجھے اسرار و رموز سے متعارف کراتے ہیں۔ ان قہقہوں کو جو میرے دل کی گرمی سے بلند ہوتے ہیں۔ اور مجھے خدا کے رموز و کنایات سے روشناس کراتے ہیں۔"

شعر و ادب کے متعلق جبران کا نظریہ بہت بلند ہے۔ شاعر کے متعلق وہ کہتا ہے۔ کہ "شاعر ایک پیغمبر ہے۔ جو روح کل کا پیغام ایک ایک روح تک پہنچاتا ہے۔ اگر کسی میں پیغام پہنچانے کا یہ وصف موجود نہیں تو یقین رکھو کہ وہ شاعر بھی نہیں۔"

ادب کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ کہ "میں ادب میں تین چیزوں کو پسند کرتا ہوں۔ سرکشی، انوکھاپن اور انفرادیت۔ اور تین باتوں کو ادب میں ناپسند سمجھتا ہوں۔ تقلید، بگاڑ اور پابندی۔

ادیب کے متعلق جبران کہتا ہے "ادیب ایک حق گو انسان ہے۔ اگر کسی ادیب کے پاس کوئی سچی اور واقعیت پر مبنی بات نہیں۔ تو وہ ادیب ہی نہیں۔"

ادبی چوروں کے متعلق وہ لکھتا ہے :۔

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تیرے مال سے تو دامن بچاتے ہیں لیکن تیرے افکار واقوال کو چرا لینا اُن کے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔ . . . ."

"کچھ لوگ تیرے بے پایاں سمندر سے چلو بھر پانی لیتے ہیں۔ اور پھر اپنی چھوٹی ندیوں پر اُتراتے ہیں۔" . . . .

زندگی اور موت کے متعلق یہ ادیب فلاسفر لکھتا ہے۔

"لوگ زندگی کے غلام ہیں جس کے سبب سے ان کے دن ذلّت و رسوائی ساتھ لاتے ہیں۔ اور ان کی راتیں لہو اور آنسو جلو میں لئے آتی ہیں۔" . . . .

. . . . "تعجّب ہے۔ کہ ہم نیند سے محبّت کرتے ہیں لیکن موت سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بڑے خوش آئند خواب ہیں۔" . . .

یہ ہیں چند مثالیں جبران خلیل جبران کے وسیع ادب اور بسیط فلسفہ

کی جبران کے اسلوب نگارش میں یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ وہ ادب و فلسفہ کے جس پہلو کو لیتا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا کوزۂ ادب ایک بحرِ بیکراں کی حیثیت رکھتا ہے جس میں غواصان ادب کے لئے درہائے معانی کا گنج گرانمایہ موجود ہے۔ اس لئے اس کے ادبی محاسن اور فلسفیانہ نکتہ طرازیوں کے متعلق مجھ جیسے ہیچمدان کا قلم اٹھانا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

اس ادیب شہیر کے ادبی شاہکاروں کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو دان ہندوستانیوں کے سامنے رکھنے میں سب سے زیادہ حصہ حضرت بشیر ہندی کا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے جبران خلیل جبران کی تصنیف "المجنون" کو اردو کا جامہ پہنا کر ترجمے کا نام "پاگل" رکھا۔ اور اس "پاگل" نے اہل ذوق حضرات کو پاگل بنا دیا۔ اس کے بعد حبیب اشعر دہلوی صاحب نے جبران کی دو کتابوں کے تراجم کئے۔ اور ان کا آخری ترجمہ اس کتاب کا ہے۔ جس کو میں اس سے بہت پہلے براہِ راست عربی زبان سے اردو میں منتقل کر چکا تھا۔ یعنی الارواح المتمردہ"!

اس کے بعد مولوی عبدالسبوح قاسمی صاحب نے جبران کے مختلف مضامین

کا ترجمہ کیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے متعلق اگر میں اپنی رائے ظاہر کر دوں۔ تو ایک طویل بحث شروع ہو جائے گی۔ جسے مجھ جیسا صلح جو پسند نہیں کر سکتا۔ باقی رہا میں خود تو میں اپنے متعلق تکلفاً کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ میں اسے معیوب سمجھتا ہوں اور بشیر ہندی صاحب ان کے متعلق میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جبران نے حضرت بشیر ہندی پر اثر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اتنی بات ضرور ہے کہ بشیر صاحب کی قنوطیت دراصل ان کی جبران پرستی ہے

کسی غیر زبان سے ترجمہ کرنا ایک فنِ خاص کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ترجمے کے لئے مصنف کے رشحاتِ قلم کی مرکزی روح کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی مترجم کو یہ شعور حاصل نہیں تو اس کا کیا ہوا ترجمہ ایک بیجان چیز بن کر رہ جائے گا۔ بشیر ہندی صاحب نے جس حد تک جبران خلیل جبران کے فلسفہ کو سمجھا ہے اس کی بیّن دلیل وہ تراجم ہیں جو ہندی صاحب نے اس سے پہلے پیش کئے "پیش رو" میں بشیر ہندی صاحب کی یہ قابلیت اور بھی روشن ہو گئی ہے۔ ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ اور آپ ان کے آرٹ کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ابو العلا چشتی (حاجی لق لق)

مدیر "زمیندار" لاہور

تمہید

تُم اپنے پیش رو آپ ہو۔ اور یہ جو اونچے اونچے مینار تم نے بنائے ہیں۔ یہ در اصل بنیادیں ہیں۔ تمہاری خود اپنی پرعظمت شخصیت کی اور تمہاری یہ پرعظمت شخصیت بھی آگے چل کر اساس بنے گی اور بلندیوں کی۔

میں خود بھی اپنا پیش رو آپ ہوں۔ لمبا سایہ جو طلوعِ آفتاب کے وقت میرے سامنے پھیل جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت سمٹ کر میرے پاؤں تلے آجائے گا۔ اور پھر دوسرا طلوعِ آفتاب میرے سامنے ایک دوسرا سایہ پھیلا دے گا اور وہ سایہ بھی ایک دوسری دوپہر کے وقت سکڑ کر میرے پاؤں تلے آجائے گا۔

ہم ہمیشہ سے اپنے پیش رو آپ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اور آج تک جو کچھ ہم نے بٹورا اور بٹوریں گے وہ اپر کھیتوں کے بیج ہوں گے۔ ہم ہی کھیت ہیں اور ہالی بھی، بٹورنے والے اور بٹورے ہوئے۔

جب تم کہر میں ایک آوارہ تمنّا کی صورت میں سرگرداں تھے، میں خود بھی وہاں ایک آوارہ تمنّا کی شکل میں تھا، تب ہم نے ایک دوسرے کی تلاش کی۔ اور ہمارے ایک دوسرے کے اس شوق نے خوابوں کو جنم دیا۔ اور یہ خواب کیا ہیں ایسا وقت جو لاانتہا ہے اور ایسی وسعت جو لامحدود ہے۔

اور جب تم زندگی کے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر ایک خاموش لفظ تھے، میں خود بھی وہاں تھا ایک دوسرا خاموش لفظ —— پھر زندگی نے ہمیں اگل دیا۔ اور ہم سالوں پر دیروز کی دھڑکتی یاد اور فردا کے ارمان لئے نیچے اترے۔ کیونکہ دیروز موت پر فتح تھی اور فردا پیدائش کا تعاقب۔

اور اب ہم خدا کے ہاتھوں میں ہیں۔ تم اس کے دائیں ہاتھ میں ایک سُورج ہو اور میں اس کے بائیں ہاتھ میں ایک زمین ہوں۔ پھر بھی تم زیادہ روشن نہیں ہو، جتنا کہ میں منوّر ہوں۔

اور ہم سُورج اور زمین ـــــ ایک بڑے سورج اور بڑی زمین کا
آغاز ہیں اور ہمیشہ آغاز رہیں گے۔
تم اپنے پیش رو آپ ہو ـــــ تم جو میرے باغ کے سامنے سے
گزرنے والے ایک اجنبی ہو۔
اور مَیں خود بھی اپنا پیش رو آپ ہوں۔ گو میں درختوں کی چھاؤں میں
بیٹھا ہوں اور بے حس و حرکت دکھائی دیتا ہوں۔

اللہ کا سادہ لوح بندہ

ایک دفعہ صحرا سے سریا کے پُر عظمت شہر میں ایک آدمی آیا۔ وہ بڑا پُرا خیالی تھا۔ اور سدا خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ اس کے پاس تن کے کپڑوں اور عصا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

جب وہ گلی کوچوں میں سے گزرتا۔ تو وہ حیرت واستعجاب سے سریا کے کلیساؤں۔ میناروں اور محلوں کو دیکھتا۔ سریا ایک عظیم الشان شہر تھا۔ اس نے بار بار راہ چلتے لوگوں سے ان کے شہر کے متعلق پوچھا۔ لیکن وہ اس کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ اور نہ وہ ان کی زبان سے واقف تھا۔

دوپہر کے وقت وہ ایک وسیع ہوٹل کے سامنے ٹھہر گیا جو سنہرے پتھر کا بنا ہوا تھا لوگ اس میں بلا تکلف آجا رہے تھے۔

"یہ ضرور کوئی زیارت گاہ ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اور اس کے اندر چلا گیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع کمرہ میں ہے۔ اور بہت سے مرد اور عورتیں میزوں کے گرد بیٹھے کھا پی رہے ہیں۔ اور مغنیوں سے نغمے سُن رہے ہیں۔

"نہیں نہیں" اس نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ پوجا نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور کوئی دعوت ہے۔ جو شہزادے نے کسی خاص تقریب پر اپنے احباب کو دی ہے۔"

اتنے میں ایک آدمی جسے اس نے شہزادہ کا غلام سمجھا۔ اس کے قریب آیا۔ اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے شراب کباب اور لذیذ مٹھائیاں اس کے سامنے رکھیں۔

جب وہ سیر ہو چکا۔ تو وہ جانے کے خیال سے اٹھا۔ مگر دروازے پر ایک خوش پوش لانبے آدمی نے اسے روک لیا۔

"یہ ضرور شہزادہ ہے" اس نے اپنے دل میں کہا۔ اور اس کے سامنے جھک کر اظہارِ تشکر کیا۔ پھر اس لانبے آدمی نے اپنی شہری زبان میں کہا "جناب آپ نے کھانے کی قیمت ادا نہیں کی۔"

وہ اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اور دوبارہ پُر زور الفاظ میں شکریہ ادا کیا اس پر اس لابنے آدمی نے قریب سے تیز نگاہ ڈالی اور غور سے دیکھا۔ کہ وہ ایک نادار اجنبی ہے اور کھانے کا بل چکانے کے ناقابل ہے۔ پھر اس نے تالی بجائی۔ اور شہر کے چار روندیے آ گئے۔ انہوں نے توجہ سے لابنے آدمی کی بات سُنی اور پھر اس کو اپنے درمیان گھیر لیا۔ دو اس کے دائیں جانب اور دو بائیں جانب کھڑے ہو گئے۔ تب اس نے ان کے پُر تکلف لباس اور ان کے طور طریق پر غور کیا۔ اور ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

اس نے کہا "شاید یہ شہر کے معزز لوگ ہیں"۔

پھر وہ چلتے چلتے عدالت میں پہنچے اور اس نے اپنے سامنے ایک لمبی داڑھی والے معزز آدمی کو شاہانہ لباس زیب تن کئے تخت پر بیٹھے دیکھا اس نے سمجھا کہ یہ بادشاہ ہے۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہوا کہ مجھے بادشاہ کے حضور لایا گیا۔

سپاہیوں نے جج کے سامنے جو ایک معزز آدمی دکھائی دیتا تھا۔ استغاثہ پیش کیا۔ اور جج نے مدعی اور مدعا علیہ کیلئے دو وکیل مقرر کئے۔ وہ ایک دوسرے کے بعد اٹھے۔ اور اپنے اپنے موکل کے حق میں دلائل پیش کئے۔ یہ شخص سمجھا

کہ میری شان میں قصیدے کہے جارہے ہیں چنانچہ اس کے دل میں بادشاہ اور شہزادے کی عزت افزائی کیلئے جذباتِ تشکر پیدا ہوئے۔

اسے سزا کا حکم سنا دیا گیا تھا۔ سزا یہ تھی، کہ ایک تختی پر اس کے جرم کی نوعیت لکھ کر اس کے گلے میں لٹکا دی جائے اور ایک برہنہ پیٹھ گھوڑے پر بٹھا کر اسے شہر میں پھرایا جائے۔ اور اس کے آگے آگے ترئی اور ڈھول بجانے والا اس کے جرم کی منادی کرتا جائے۔ چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا۔

اب جبکہ اس کو شہر میں گھوڑے کی برہنہ پیٹھ پر سوار کر کے پھرایا جارہا تھا اور آگے ترئی اور ڈھول سے منادی کی جارہی تھی۔ شہر کے باشندے شور و غوغا سن کر دوڑے ہوئے آئے۔ اور اسے دیکھ کر سب کے سب ہنس دیئے۔ بچے بالے ان کے پیچھے پیچھے گلیوں اور کوچوں میں بھاگتے اور شور مچاتے پھرتے۔

اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اور آنکھوں میں فرطِ مسرت سے ایک خاص چمک پیدا ہوگئی۔ کیونکہ اس نے اپنے جرم کی تختی کو بادشاہ کی قدر و منزلت کا نشان جانا۔ اور ہجوم کو عزت افزائی کے طور پر ایک جلوس سمجھا۔ اس حال میں جب وہ جارہا تھا۔ تو اس نے ہجوم میں اپنے ایک صحرا

نشین ہموطن کو دیکھا۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اور اس نے چلا چلا کر کہا "دوست! دوست!! ہم کہاں ہیں۔ یہ کیسا دل لبھانے والا شہر ہے۔ یہاں کے میزبان کتنے اچھے ہیں۔ جو ایک غیر متوقع مہمان کی اپنے محلوں میں دعوت کرتے ہیں۔ شہزادے اس کے ہم جلیس ہوتے ہیں۔ اور بادشاہ اسے اپنی خوشنودی کا نشان عطا کرتا ہے۔ اور اس شہر کی مہمان نوازی سے شہرت یاب کرتا ہے جس کا نزول آسمان سے ہوا ہے"

اس کے ہموطن نے اسے کوئی جواب دیا۔ وہ مسکرایا۔ اور اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور جلوس آگے نکل گیا۔

اس نے بڑی شان سے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں روشنی جھلک رہی تھی۔

مُحبّت

کہتے ہیں کہ گیدڑ اور چھچھوندر —
ایک ہی ندی سے باہم پانی پیتے ہیں۔
جہاں شیر بھی پانی پینے آتا ہے!

کہتے ہیں کہ عقاب اور گدھ —
ایک ہی لاش میں اپنی چونچیں مارتے ہیں،
اور ایک دوسرے کے ساتھ صلح و آشتی سے رہتے ہیں،
جب تک کہ لاش اُن کے سامنے رہے۔

اے محبت، تیرا مضبوط ہاتھ

میری خواہشات کو روکے ہوئے ہے،

اور میری بھوک اور پیاس کو سطوت اور نخوت کی سطح تک بلند کئے ہوئے ہے

وُہ ________

جو مجھ میں طاقتور اور اٹل ہے

تو اسے روٹی نہ کھانے دے اور پانی نہ پینے دے۔

وُہ میرے کمزور ارادے کو ورغلاتا ہے

بہتر ہے، مجھے بھوکا مرنے دے،

اور میرا دل پیاس سے جل بھن جانے دے۔

مجھے مرنے دے۔

مجھے فنا ہونے دے۔

پیشتر اس کے کہ میں اپنا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھاؤں،

جسے تو نے نہیں بھرا

جسے تیرے مقدس ہاتھوں نے نہیں چھوا۔

تارکِ دُنیا بادشاہ

لوگوں نے مجھے بتایا کہ پہاڑوں کے درمیان ایک کنج میں ایک نوجوان تنہا رہتا ہے۔ جو کبھی ان دو دریاؤں کے پار ایک وسیع ملک کا تاجدار تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وُہ اپنی مرضی سے تاج و تخت اور اپنے پر عظمت ملک کو خیر باد کہہ کر اس جنگل میں آ بسا ہے۔

اور میں نے کہا میں اس شخص کی تلاش کروں گا اور اس کے دل کا راز معلوم کروں گا۔ کیونکہ وہ شخص جس نے تاج و تخت چھوڑا ہو یقیناً ایک سلطنت سے زیادہ حیثیت کا مالک ہے۔

اسی دن میں نے اس جنگل کی راہ لی۔ جہاں وہ رہتا تھا۔ اور میں نے اس کا کھوج پا لیا۔ وہ سرو کے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ

میں ایک چھڑی تھی۔ عصائے شاہی کی طرح۔ میں یوں آداب بجالایا جیسے میں کسی بادشاہ کا آداب بجالاتا۔ اس نے میری طرف رُخ پھیرا اور نرم لہجے میں کہا۔ "تم اس پرسکون جنگل میں کیوں آئے ہو۔ کیا تم ان ہرے بھرے درختوں کی چھاؤں میں اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ یا اس دھند لکے میں گھر واپس جا رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں صرف تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کا تمنائی ہوں۔ کہ تم نے جنگل کیلئے حکومت کیوں چھوڑی؟"

اس نے کہا۔ "میری کہانی مختصر ہے۔ کیونکہ یہ بلبلا بہت جلد ٹوٹ گیا۔ واقعہ یوں ہوا۔"

ایک دن میں اپنے محل کے دریچے میں بیٹھا تھا۔ میرا وزیر اور ایک غیر ملک کا سفیر میرے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ جب وہ میرے دریچے کے قریب پہنچے تو وزیر اپنے متعلق کہہ رہا تھا "میں بادشاہ کی طرح ہوں..... مجھے بھی تیز شراب کی پیاس ہے..... مجھے بھی وقت اور تقدیر کے کھیلوں کا شوق ہے..... میں بھی اپنے آقا کی طرح پرجوش مزاج رکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وزیر اور سفیر درختوں میں غائب ہو گئے۔ لیکن چند منٹوں میں وہ

واپس آگئے۔ اب کی بار وزیر میرے متعلق باتیں کر رہا تھا۔" میرا آقا ——

بادشاہ سلامت میری طرح ایک اچھا نشانچی ہے .... وہ بھی

میری طرح موسیقی کا رسیا ہے ... اور دن میں تین بار غسل کرتا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"اُسی دن شام کو میں ایک لبادہ پہن کر محل سے نکل آیا۔ کیونکہ ان لوگوں

کا حکمران بننا مجھے گوارہ نہ تھا۔ جو میرے عیوب اختیار کریں۔ اور

میری نیکیوں کو اپنی طرف منسوب کریں"۔

اور میں نے کہا۔ "واقعی یہ ایک انوکھی اور حیران کن بات ہے"۔

اور اس نے کہا۔ "نہیں میرے دوست۔ تم نے میری خاموشیوں کے

دروازے کو کھٹکھٹایا۔ اور تمہیں کیا ملا" بہت ہی کم، آخر کون ہے۔ جو حکومت

کو اس جنگل کی خاطر نہ چھوڑ دے۔ جہاں کے موسم ایک نہ ختم ہونیوالے رقص

نغمے میں سرمست رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہو گزرے ہیں جنہوں نے

تنہائی اور اکیلے میں اپنی صحبت کا خود لطف اٹھانے سے کم تر چیز

کے لئے اپنی حکومت چھوڑ دی۔ بے شمار عقاب ہیں جو عالم بالا کو چھوڑ کر چھچھوندروں

کے ساتھ آ کر رہتے ہیں کہ وہ زمین کی تہ کا راز پا سکیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو

سپنوں کی بادشاہت کو خیرباد کہہ دیتے ہیں تاکہ وہ بے خواب کی دنیا سے دو
نظر نہ آئیں۔ اور پھر ایسے بھی ہیں۔ جو عریانی کی دنیا کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور اپنی روحوں
کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ تاکہ دوسرے لوگ عریاں صداقت اور بے نقاب
حقیقت کو دیکھ کر شرما نہ جائیں۔ اور ان سب سے بلند مرتبہ وہ ہے جس نے
غم والم کی دنیا کو خیرباد کہا۔ کہ وہ مغرور اور خود پسند نظر نہ آئے۔"

پھر وہ اپنی چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے اٹھا اور کہا "اب تم اپنے شہر
میں جاؤ، اور اس کے دروازے پر بیٹھو اور ان لوگوں پر نگاہ رکھو جو وہاں
آتے ہیں اور وہاں سے جاتے ہیں۔ اور اس شخص کی تلاش کرو۔ جو پیدائشی
بادشاہ ہے لیکن مملکت کے بغیر ہے۔ اور اسے دیکھو جو جسمانی طور پر دوسروں
کا محکوم ہے لیکن روحوں پر حکومت کرتا ہے۔ مگر نہ تو خود اسے اس بات کا
احساس ہے اور نہ اس کی رعایا ہی یہ جانتی ہے۔ اور اس پر بھی نگاہ رکھو
جو بظاہر حکومت کرتا ہے لیکن دراصل وہ اپنے ہی غلاموں کا غلام ہے"
یہ باتیں کہہ چکنے کے بعد وہ مجھ پر مسکرا دیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ہزاروں
صبحیں تھیں۔ پھر اس نے رُخ پھیرا اور جنگل کی گہرائیوں میں چلا گیا۔
میں شہر کو لوٹا۔ اور اس کے حسبِ منشا شہر کے دروازے پر بیٹھ کر

آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ اس دن سے لے کر آج تک بے شمار ہوئے ہیں۔ جن کے سائے مجھ پر سے گزرے ہیں۔ اور بہت کم ایسے لوگ ہیں۔ جن پر سے میرا سایہ گزرا ہے۔

شیر کی بلّی

چار غلام ایک بوڑھی ملکہ کو جو تخت پر محوِ خواب تھی کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ ملکہ خراٹے لے رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک بلی لیٹی غرّا رہی تھی اور غلاموں کی طرف ستاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

پہلے غلام نے کہا "یہ بوڑھیا نیند میں کس قدر بدصورت نظر آتی ہے۔ دیکھو تو اس کا چہرہ کیسے لٹک گیا ہے۔ اور یہ سانس کس طرح لے رہی ہے۔ جیسے شیطان اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔"

بلّی نے غرّاتے ہوئے کہا۔ "یہ نیند کے عالم میں اتنی بدنما معلوم نہیں ہوتی۔ جتنے کہ تم غلام، بیداری کی حالت میں معلوم ہوتے ہو۔"

دوسرے غلام نے کہا۔ تم یہ سوچ رہے ہو گے۔ کہ نیند میں اس کی

جھریاں گھری ہونے کے بجائے نکھر رہی ہیں۔ یہ ضرور کوئی بُرا خواب دیکھ رہی ہے۔"

بلّی نے غرّا کر کہا۔"کاش تم بھی سو کر اپنی آزادی کے خواب دیکھتے۔"

تیسرے غلام نے کہا۔"غالباً یہ ان لوگوں کا جلوس دیکھ رہی ہے جو اس نے قتل کئے۔"

بلّی نے غرّاتے ہوئے کہا۔"ہاں یہ تمہارے آباؤ اجداد اور تمہارے ورثا کا جلوس دیکھ رہی ہے۔"

چوتھے غلام نے کہا۔"اس کے متعلق باتیں کرنا تو ایک اچھا مشغلہ ہے لیکن کھڑے کھڑے پنکھا جھلنا کچھ کم مصیبت نہیں۔"

بلّی نے غرّاتے ہوئے کہا۔"تم ابد تک پنکھا جھلتے رہو گے۔ جیسے تم زمین پر ہو ویسے ہی تم آسمان پر رہو گے۔"

اس وقت بوڑھی ملکہ نے سوتے میں اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اور اس کا تاج زمین پر آ گرا۔

ایک غلام نے کہا۔"یہ بُرا شگون ہے۔"

اور بلّی نے غرّا کر کہا۔"ایک شخص کا برا شگون دوسرے کے لئے نیک

شگون ہوتا ہے"

دوسرے غلام نے کہا۔"اگر یہ بیدار ہو جائے۔ اور اپنا تاج زمین پر گرا ہوا پائے۔ تو یقیناً ہمیں قتل کر دے"

بلّی نے غرّاتے ہوئے کہا۔"تمہاری پیدائش کے وقت سے یہ تمہیں ہر روز قتل کر رہی ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے"

تیسرے غلام نے کہا۔"ہاں یہ ہمیں قتل کر دیگی۔ اور اسے دیوتاؤں کی قربانی تصور کرے گی۔

بلّی نے غرا کر کہا"صرف کمزور ہی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں"

چوتھے غلام نے دوسرے غلاموں کو چپ کراتے ہوئے اور ملکہ کو بیدار کئے بغیر آہستہ سے تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

بلی نے غرّاتے ہوئے کہا۔"صرف ایک غلام ہی گرے ہوئے تاج کو دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ سکتا ہے"

کچھ دیر بعد بوڑھی ملکہ بیدار ہوئی۔ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا اور ایک جمائی لی۔ اور کہا۔"میرا خیال ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی تھی میں نے

دیکھا کہ ایک بچھو شاہ بلوط کے ایک پرانے درخت کے اردگرد چار کیچوؤں کا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ خواب مجھے پسند نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ پھر آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ اور خراٹے لینا شروع کر دیے چاروں غلام اسے پنکھا جھلتے رہے بلّی نے غرا کر کہا۔ "جھلتے جاؤ —— ہاں پنکھا جھلے جاؤ بیوقوفو اور اس آگ کو ہوا دیتے جاؤ۔ جو تمہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔"

ظلم!

سات غاروں کی نگرانی کرنے والی ایک مادہ اژدہا سمندر کے کنارے پر یوں گا رہی تھی۔

"میرا رفیق دوش امواج پر سوار آئے گا۔ اور اس کی گرج کرۂ ارض کو خوف سے معمور کر دے گی۔ اور اس کے نتھنوں کے شعلے آسمان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ چاند گرہن کے موقع پر ہماری شادی ہوگی، اور سورج گرہن کے وقت میں ایک بچہ جنوں گی جو ہمیں قتل کر دے گا۔"

ایک مادہ اژدہا سمندر کے کنارے سات غاروں کی نگرانی کرتے ہوئے یونہی گائے چلی جا رہی تھی۔

درویش

جب میں جوان تھا۔ تو ایک مرتبہ ایک درویش سے ملا۔ جو پہاڑیوں سے پرے ایک خاموش اور پرسکون کنج میں رہتا تھا۔ ہم نیکی کی حقیقت پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک تھکا ماندہ ڈاکو پہاڑی سے لنگڑاتا ہوا آیا۔ جب وہ کنج کے پاس پہنچا۔ تو وہ درویش کے سامنے جھکا اور بولا "سائیں بابا کیا مجھے آرام ملے گا۔ میں گناہوں سے دبا ہوا ہوں"۔

درویش نے جواب دیا —— "میں خود بھی اپنے گناہوں سے دبا ہوا ہوں"۔

ڈاکو نے کہا —— لیکن میں چور اور لٹیرا ہوں

درویش نے جواب دیا۔ میں خود بھی ایک چور اور لٹیرا ہوں۔

ڈاکو نے کہا۔ "لیکن میں خونی ہوں اور لاتعداد انسانوں کا خون میرے کانوں میں چیخ رہا ہے"۔

درویش بولا۔ "میں خود بھی ایک قاتل ہوں۔ اور بے شمار انسانوں کا خون میرے کانوں میں چیخ رہا ہے"۔

ڈاکو نے کہا۔ "میں نے ان گنت جرم کئے ہیں"۔

درویش کہنے لگا۔ "میں نے خود بھی لاتعداد جرم کئے ہیں"۔

تب وہ ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا۔ اور درویش کو دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی تھکاوٹ تھی۔ اور جب وہ ہم سے الگ ہوا۔ تو وہ پہاڑی سے جست لگاتا گیا۔

میں درویش سے مخاطب ہوا اور کہا ——— "آپ نے خود کو ناکردہ گناہوں کا مجرم کیوں ٹھہرایا۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ یہ آدمی آپ سے بدظن ہو کر گیا ہے"۔

درویش نے جواب دیا ——— "یہ درست ہے، کہ اب اسے مجھ پہ اعتقاد نہیں رہا۔ لیکن وہ یہاں سے بے حد مطمئن گیا ہے"۔

اس وقت ہم نے ڈاکو کو فاصلے پر گاتے ہوئے سنا۔ اس کے گیت کی گونج وادی کو مسرت سے لبریز کر رہی تھی۔

اقتدار پرست

ایک مرتبہ میں نے ایک انسانی سر اور آہنی سموں والا دیو دیکھا جو پیہم زمین کو کھاتا۔ اور سمندر کو پیتا تھا۔ میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں اس کے قریب گیا۔ اور پوچھا "کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں؟ کیا تم کبھی سیر نہیں ہوتے اور تمہاری پیاس کبھی نہیں بجھی"؟

اور اس نے جواب دیا "ہاں، میں مطمئن ہوں، نہیں میں کھانے اور پینے سے اکتا گیا ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے، کہ کل میرے کھانے کے لئے نہ زمین باقی رہے گی اور نہ پینے کے لئے کوئی سمندر رہے۔"

نفسِ اعلیٰ

واقعہ یوں ہوا۔ کہ شاہ بابل نفسی بال تاج پوشی کے بعد اپنی خوابگاہ میں گیا۔ جو تین لاماؤں نے اس کے لئے خاص طور پر تیار کی تھی۔ اس نے اپنا تاج اور شاہی لباس اُتارا۔ اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر اپنے متعلق خیال آرائیوں میں محو ہو گیا۔ کہ اب وہ بابل کا زبردست حکمران تھا۔

یکایک اس نے رُخ پھیرا اور دیکھا، کہ اس نقرئی آئینے میں سے جو اس کی ماں نے اسے دیا تھا۔ ایک ننگا انسان باہر نکل رہا ہے۔ بادشاہ چونکا اور باآوازِ بلند اس شخص سے پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو"؟

اس ننگے آدمی نے جواب دیا۔ "صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ لوگوں

نے تجھے شاہی تاج کیوں پہنایا؟"

بادشاہ نے کہا۔۔۔۔"کیونکہ میں سارے ملک میں سب سے نجیب تھا۔"

پھر ننگے آدمی نے کہا۔"اگر تم اس سے بھی زیادہ نجیب ہوتے۔تو بھی تم بادشاہ بننے کے قابل نہ تھے۔"

بادشاہ نے کہا۔"کیونکہ میں ملک میں سب سے شہ زور آدمی ہوں۔ اس لئے انہوں نے مجھے تاج پہنایا۔"

اور اس ننگے آدمی نے کہا۔"اگر تم اس سے بھی شہ زور ہوتے۔تو بھی تم بادشاہ نہ بنتے۔"

پھر بادشاہ نے کہا"کیونکہ میں سب سے زیادہ عقلمند ہوں۔اس لئے انہوں نے مجھے تاج پہنایا۔"

اور اس ننگے آدمی نے کہا۔"اگر تم اس سے بھی زیادہ عقلمند ہوتے۔تو تمہیں بادشاہ نہ بننا چاہیئے تھا۔"

پھر بادشاہ فرش پر گر پڑا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔
ننگے انسان نے اس کی طرف نیچی نگاہ سے دیکھا۔پھر اس نے تاج

اٹھایا۔ اور شفقت سے بادشاہ کے جھکے ہوئے سر پہ رکھ دیا۔

اور بادشاہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہُوا آئینہ میں داخل ہو گیا۔

بادشاہ اٹھا۔ اور آئینے میں دیکھا۔ اور اب کی بار وہ اپنے آپ کو تاج پہنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

جنگ اور چھوٹی قومیں

ایک دفعہ ایک مرغزار میں جہاں ایک بھیڑ اور اس کا بچہ چرچگ رہے تھے ایک عقاب بچے پر بھوکی نظریں جمائے فضا میں منڈلا رہا تھا۔ اور جب وہ اپنے شکار پر جھپٹنے اور اسے پکڑنے لگا۔ تو ایک دوسرا عقاب نمودار ہوا اس نے بھی بھیڑ اور اس کے بچے پر حریصانہ نگاہیں ڈالیں۔ اب دونو حریف آپس میں لڑنے لگے۔ اور اُنہوں نے اپنی خوفناک چیخوں سے آسماں سر پر اٹھا لیا۔

بھیڑ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بہت حیران ہوئی اور مڑ کر بچے سے کہا۔

"میرے بچے کتنی عجیب بات ہے کہ یہ دو نجیب پرندے ایک

دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔ کیا ان دونوں کے لئے یہ آسمان کی وسعت

کم ہے۔ میرے ننھے بچے ——— میرے پیارے بچے دعا کر ———

ہاں خلوص دل سے دُعا کر کہ خدا تیرے پروار بھائیوں میں صلح و آشتی

کا جذبہ پیدا کرے"

اور بچے نے اپنے دل میں دعا کی۔

نکتہ چین

ایک رات کا ذکر ہے کہ ایک آدمی گھوڑے پر سمندر کی طرف سفر کرتا ہوا سڑک کنارے ایک سرائے میں پہنچا۔ وہ اترا۔ اور سمندر کی جانب سفر کرنے والے سواروں کی طرح رات اور انسانیت پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے گھوڑے کو سرائے کے دروازے کے قریب درخت سے باندھا اور سرائے میں چلا گیا۔

آدھی رات کے وقت جب تمام لوگ سو رہے تھے۔ ایک چور آیا۔ اور مسافر کا گھوڑا چرا لے گیا۔

صبح وہ آدمی اٹھا۔ اور دیکھا۔ کہ اس کا گھوڑا چوری ہو گیا ہے۔ وہ گھوڑا چرائے جانے پر بیحد غمگین ہوا، اور نیز اس بات پر اسے بے حد

افسوس ہوا کہ ایک انسان نے اپنے دل کو گھوڑا چرانے کے خیال سے

ملوث کیا۔

تب سرائے کے دوسرے مسافر آئے اور اس کے گرد کھڑے ہو کر

باتیں کرنے لگے۔

پہلے آدمی نے کہا۔"کیا یہ تمہاری حماقت نہیں۔ کہ تم نے گھوڑے

کو اصطبل سے باہر باندھا۔"

دوسرے نے کہا۔"اور یہ اس سے بڑھ کر حماقت ہے کہ گھوڑے

کو چھنال نہیں لگائی۔"

تیسرے نے کہا۔"اور یہ حماقت کی انتہا ہے کہ سمندر کی طرف گھوڑے

پر سفر کیا جائے۔"

چوتھے نے کہا۔"صرف سست اور کاہل لوگ ہی گھوڑے

رکھتے ہیں۔"

تب مسافر بیحد حیران ہوا۔ آخر کار چلایا۔"میرے دوستو

کیا تم اس لئے میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو گنوا رہے ہو۔ کہ

میرا گھوڑا چوری ہو گیا لیکن اعجوبہ یہ ہے۔ کہ تم نے ایک

لفظ بھی اس شخص کے متعلق نہیں کہا۔ جس نے میرا گھوڑا چُرایا۔۔۔!

شعراء

چار شاعر شراب کے ایک پیالہ کے گرد بیٹھے تھے۔ جو میز پر رکھا تھا۔

پہلے شاعر نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں اپنی تیسری آنکھ سے اس شراب کی مہک کو وسعت پر ایسے منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں جیسے کسی سحر زدہ جنگل پر پرندوں کا ایک جھلّہ"۔

دوسرے شاعر نے اپنا سر اٹھایا اور کہا "میں اپنے باطنی کان سے ان موہوم پرندوں کو گاتے ہوئے سن رہا ہوں۔ اور ان کا نغمہ میرے دل کو یوں تھامے ہوئے ہے۔ جیسے سفید گلاب شہد کی مکھی کو اپنی پنکھڑیوں میں قید کر لیتا ہے"۔

تیسرے شاعر نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اور آسمان کی طرف بازو پھیلاتے ہوئے کہا "میرا ہاتھ انہیں چھو رہا ہے۔ اور میں ان پرندوں کے پروں کو یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے محوِ خواب حسن کی سانس میری انگلیوں سے ٹکرا رہی ہو۔"

تب چوتھا شاعر اٹھا۔ اور پیالے کو بلند کرتے ہوئے کہا۔ "افسوس دوستو، میں تمہاری طرح دیکھنے ــــ سننے اور چھونے کی ان صلاحیتوں سے اس قدر محروم ہوں۔ کہ میں اس شراب کی مہک نہیں دیکھ سکتا اور نہ موہوم پرندوں کا کوئی نغمہ سُن سکتا ہوں اور نہ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہی کو محسوس کر سکتا ہوں ــــ میں صرف شراب دیکھتا ہوں شراب ــــ اور مجھے اب اسے پینا ہی ہوگا۔ تاکہ اس سے میرے حواس میں بھی تیزی پیدا ہو جائے اور میں تمہارے تخیل کی بلندیوں تک پہنچ سکوں۔

اور پیالے کو اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے وہ شراب کی تلچھٹ تک پی گیا۔

تینوں شاعر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ایک غیر شاعرانہ اور پیاسی نفرت تھی۔

مُرغِ بادنما

مُرغِ بادنما نے ہوا سے کہا۔ "تمہارا ہمیشہ ایک ہی طرح چلتے رہنا کِتنا تھکا دینے والا ہے۔ کیا تم میرے چہرے سے ہٹ کر کوئی دوسرا رُخ اختیار نہیں کر سکتیں؟ کیونکہ تم میری خداداد استقامت کو پریشان کئے دیتی ہو۔"

لیکن ہوا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور فضا میں صرف ایک قہقہہ سنائی دیا۔

اردوس کا بادشاہ

ایک دفعہ اردوس کے زعما بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے، اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی مملکت میں ایک ایسا فرمان جاری فرمائے جس کی رُو سے رعایا کے لئے تمام قسم کی شرابیں اور دیگر منشیات ممنوع قرار دی جائیں۔

لیکن بادشاہ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ہنستا ہؤا وہاں سے چلا گیا۔

تب شہر کے زعما مایوس ہو کر وہاں سے لوٹے۔

محل کے دروازے پر وہ حاجب سے ملے۔ اور حاجب نے معلوم کیا کہ انہیں کچھ رنج ہے۔ اور وہ ان کے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

پھر اس نے کہا۔ "حالت قابل رحم ہے میرے دوستو۔
لیکن اگر تم بادشاہ کو ایسی حالت میں ملتے جبکہ وہ نشے میں چور ہوتا
تو وہ تمہاری درخواست یقیناً قبول کر لیتا۔"

میرے دل کی گہرائیوں سے

میرے دل کی گہرائیوں سے ایک پرندہ اٹھا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا وہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا قد گھٹ چھوٹا ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔

پہلے وہ ایک ابابیل اتنا تھا۔ پھر لوے جتنا اس کے بعد ایک شاہین کے برابر۔ اور پھر اتنا بڑا ہو گیا۔ جتنا کہ ابر بہار اور پھر اس نے ستاروں سے بھرپور آسمان کو ڈھانپ لیا۔

میرے دل کی گہرائیوں سے ایک پرندہ آسمان کی طرف اُڑا جوں جوں وہ اڑتا گیا۔ بڑا ہوتا گیا، لیکن وہ میرے دل سے نہ نکلا۔

اے میرے عقیدے اور غیر تربیت یافتہ علم! میں تیری بلندی پر کیونکر

پہنچ سکتا ہوں۔ اور انسان کی مافوق البشریت کو کیونکر آسمان پر منقوش
دیکھ سکتا ہوں۔

میں اپنے دل کے سمندر کو دھند میں کیسے بدل سکتا ہوں اور اس
ناقابل پیمائش خلا میں کیونکر تیرا ساتھ دے سکتا ہوں۔

ایک مندر میں بند قیدی مندر کے سنہری میناروں کو کیسے دیکھ
سکتا ہے۔

ایک پھل کے دل کو کیونکر اتنا وسیع کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ پھل کو اپنے
آغوش میں لے لے۔

اے میرے عقیدے! میں چاندی اور آبنوس کی سلاخوں کے
پیچھے پابہ زنجیر ہوں اور تیرے ساتھ پرواز نہیں کر سکتا۔

پھر بھی تو میرے دل سے آسمان کی طرف اڑتا ہے۔ اور یہ میرا ہی دل
ہے۔ جو تجھے اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور میں اس بات پر مطمئن ہوں۔

3 balls can be drawn out of 6
white = $^6C_3$ ways.

(20)

2 B — can be drawn out of 4 Black
in $^4C_2$ ways.

3W + 2B = M × N = 20 × 6 / 120 ; 4! = (6) ; (120/252)

خاندان

اسحانہ کی ملکہ دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ اور بادشاہ اور اس کے باوقار ارکان سلطنت پروار سانڈوں کے بڑے ایوان میں دم بخود منتظر تھے۔

دوپہر کے وقت دیکایک ایک ایلچی آیا اور بادشاہ کے حضور میں سجدہ ریز ہوکر بولا۔ "غلام! حضور بادشاہ سلامت اور غلامان شاہ کے لئے خوشخبری لایا ہے" بے رحم محراب، ملک معظم کا دیرینہ دشمن شاہ نجھروں مر گیا۔"

جب بادشاہ اور پرجلال ارکان نے یہ خوشخبری سنی وہ سب خوشی سے اچھل پڑے اور مسرت کے نعرے بلند کئے۔ کیونکہ بات یہ تھی کہ اگر بادشاہ محراب زندہ رہتا تو وہ یقیناً اسحانہ کو تاخت و تاراج کر ڈالتا۔ اور اس کے باشندوں کو غلام بنا لیتا۔

اس موقعہ پر شاہی طبیب بھی اس پر دار سانڈوں والے ہال میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے شاہی دایہ تھیں۔ وہ بادشاہ کے حضور میں سجدہ ریز ہوا اور بولا۔ میرا آقائے نامدار تا ابد سلامت رہے اور ان گنت نسلوں تک اسحانہ کے لوگوں پر اس کی حکومت قائم و دائم رہے۔ اے آقائے نامدار تیرے مشکوئے معلی میں عین اسی وقت بیٹا ہوا ہے۔ جو تیرا وارث ہوگا"۔

یہ سن کر بادشاہ کی روح نشۂ شادمانی سے سرشار ہوگئی۔ کہ ایک ہی وقت پر اس کا دشمن مر گیا اور اس کا جانشین بھی پیدا ہوگیا۔

اب شہر اسحانہ میں ایک سچا پیشین گو رہتا تھا۔ پیشین گو نوجوان اور حوصلہ مند تھا۔ اور بادشاہ نے اسی رات حکم دیا، کہ پیشین گو کو اس کے حضور میں پیش کیا جائے اور جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے کہا۔ "اب پیشگوئی کرو ہاں بتاؤ کہ میرے بیٹے کا مستقبل کیسا ہوگا۔ جس نے آج شاہی محل میں جنم لیا ہے" اور پیش گو نہ جھجکا اور اس نے کہا "سن اے بادشاہ میں ضرور تیرے بیٹے کے مستقبل کے متعلق پیشگوئی کروں گا جو آج ہی تیرے ہاں پیدا ہوا ہے۔ تمہارے دشمن کی روح ہاں تمہارے دشمن شاہ محراب کی روح جو کل شام مرا ہے، ایک دن کے لئے فضا میں منڈلاتی رہی اور پھر اس نے

اپنے لئے ایک جسم تلاش کیا۔ اور جس جسم میں وہ داخل ہوئی وہ تمہارے اس بیٹے کا جسم ہے جو تیرے ہاں ابھی پیدا ہوا ہے۔"

اس پر بادشاہ غضبناک ہو گیا، اور اس نے اپنی تلوار سے پیشن گو کا سر قلم کر دیا۔

اور اس دن سے لے کر آج تک اسحانہ کے عقلمند لوگ ایک دوسرے سے خفیہ طور پر یہ کہا کرتے ہیں "کیا یہ حقیقت نہیں۔ کیا مدت سے یہ بات مشہور نہیں۔ کہ اسحانہ پر ایک دشمن حکومت کرتا ہے۔"

5, 6w, 4 blas.
balls

6w + 4BF. 10

(3w + 2B) = 5.

5 balls cause drawn out of 10 in 8. 10C5 ways.

$nC5 = \frac{10!}{(10-5)!\,5!} = $ [illegible]

علم اور علمِ ناتمام

دریا کے کنارے ایک شہتیر تیر رہا تھا۔ اس پر چار مینڈک بیٹھے تھے
یکایک پانی کا ریلا آیا۔ اور شہتیر کو بہا کر منجدھار میں لے گیا۔ مینڈک خوش تھے
اور مطمئن کیونکہ آج تک انہوں نے ایسا لطف نہ اٹھایا تھا۔

آخر پہلا مینڈک بولا۔ "در حقیقت یہ نہایت ہی عجیب و غریب شہتیر
ہے۔ اور یوں تیرتا ہے۔ گویا زندہ ہے۔ آج تک ایسا شہتیر دیکھنے میں
نہیں آیا"۔

پھر دوسرا مینڈک بولا "نہیں میرے دوست! یہ شہتیر بھی دوسرے
گھٹوں کی طرح ہے۔ اور یہ حرکت نہیں کرتا۔ یہ تو دریا ہے۔ جو سمندر کی
طرف بہہ رہا ہے اور اپنے بہاؤ کے ساتھ ہمیں اور اس گھٹے کو لئے

جا رہا ہے۔

اور تیسرا مینڈک بولا۔ "نہ تو شہتیر تیر رہا ہے اور نہ دریا بہہ رہا ہے۔ حرکت تو ہمارے خیال میں ہے۔ کیونکہ خیال کے بغیر کوئی شے حرکت نہیں کر سکتی۔"

اور تینوں مینڈک آپس میں جھگڑنے لگ گئے کہ فی الحقیقت حرکت کرنے والی چیز کونسی ہے۔ نزاع بڑھتی گئی۔ اور بات میں جوش و خروش پیدا ہوتا گیا۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

پھر انہوں نے چوتھے مینڈک سے پوچھا جو اس وقت تک ساری بحث توجہ سے سنتا رہا تھا مگر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اور انہوں نے اس کی رائے دریافت کی۔ اور چوتھے مینڈک نے کہا "تم میں سے ہر ایک راستی پر ہے اور تم میں سے کوئی غلطی پر نہیں، حرکت شہتیر میں بھی ہے پانی میں بھی ہے اور ہمارے خیال میں بھی ہے۔"

اور تینوں مینڈک غضبناک ہو گئے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ اس کا دعوے سراسر صداقت پر مبنی نہیں اور دوسرے دونوں پورے طور پر غلط نہیں۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ تینوں مینڈک مل گئے۔ اور انہوں نے
چوتھے مینڈک کو شہتیر پر سے دھکا دے کر دریا میں گرا دیا۔

کاغذ کے ایک سفید ورق نے کہا......

کاغذ کے ایک سفید ورق نے کہا "میں بے داغ بنایا گیا ہوں اور ہمیشہ بے داغ ہی رہوں گا۔ اور میں جل کر سفید راکھ میں تبدیل ہونا زیادہ پسند کروں گا، بجائے اس کے کہ سیاہی مجھے چھوئے اور داغ دار میرے قریب آئے۔"

جو کچھ سفید کاغذ نے کہا۔ دوات نے سنا۔ اور اپنے تاریک دل میں ہنس دی۔ لیکن اس کے قریب جانے کی جرأت نہ کی۔

رنگ برنگی پنسلوں نے بھی سنا، وہ بھی اس کے نزدیک نہ پہنچ سکیں اور کاغذ کا سفید ورق اسی طرح بے داغ رہا، بے داغ اور صاف ——— لیکن کورا۔

ادیب اور شاعر

ایک سانپ نے ایک چنڈول سے کہا۔ "تم اڑتے ہو، لیکن تم زمین کے ان گوشوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ جہاں زندگی کا رس مکمل خاموشی میں حرکت کرتا ہے۔ اور چنڈول نے جواب دیا۔ "بے شک تم بہت سی باتیں جانتے ہو۔ نہیں تم تمام عقلمندوں سے زیادہ سیانے ہو، لیکن افسوس کہ تم اڑ نہیں سکتے۔"

سانپ نے جیسے اسے سنا ہی نہیں۔ اور وہ کہنے لگا "تم سمندر کے اسرار تک نہیں پہنچ سکتے۔ نہ ان دیکھی مملکت کے خزانوں میں گھوم سکتے ہو، ابھی کل کی بات ہے کہ میں لعلوں بھری غار میں لیٹا تھا۔ وہ پکے ہوئے انار کے دل کی طرح سرخ تھے، اور روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن اسے

آتشیں گلاب میں بدل دیتی تھی۔ میرے سوا ان اعجوبوں کو کون دیکھ سکتا ہے“
چنڈول نے کہا۔ ”کوئی نہیں۔ واقعی تمہارے سوا کوئی ہستی ازمنہ قدیم کی بلوریں یادگاروں میں لیٹ نہیں سکتی پر افسوس کہ تم گا نہیں سکتے“۔

سانپ نے کہا۔ ”مجھے ایک ایسے پودے کا علم ہے۔ جس کی جڑیں زمین میں پاتال تک جاتی ہیں۔ اور جو اس جڑ کو کھالے، وہ عشرت سے بھی حسین بن جاتا ہے۔

چنڈول نے کہا۔ ”کوئی نہیں۔ واقعی کوئی دوسرا جاندار تمہارے سوا زمین کے طلسمی خیال کو بے نقاب نہیں کر سکتا پر افسوس کہ تم اڑ نہیں سکتے“۔

سانپ نے کہا۔ ”قرمزی رنگ کی ایک ندی ہے جو پہاڑ کی تہ میں بہتی ہے۔ اور جو کوئی اس کا پانی پی لے۔ وہ لافانی بن جائے یقیناً کوئی پرندہ یا حیوان اس قرمزی ندی کو پا نہیں سکتا“۔

چنڈول نے جواب دیا۔ ”ہاں اگر تم چاہو۔ تو دیوتاؤں کی طرح لافانی بن سکتے ہو لیکن افسوس تم گا نہیں سکتے“۔

سانپ نے کہا۔ ”مجھے ایک مدفون مندر کا علم ہے جسے میں چند دہاڑے میں ایک بار ضرور دیکھتا ہوں۔ اسے دیوتاؤں کی ایک معدوم نسل نے تعمیر

کیا تھا اور اس کی دیواروں پر زماں و مکاں کے اسرار لکھے ہوتے ہیں۔ اور جو
کوئی اسے پڑھ لے۔ وہ تمام رازوں کو سمجھ لے گا۔
چنڈول نے کہا "سچ مچ اگر تم چاہو تو زماں و مکان کے سارے علم اپنے
لچکیلے جسم کے ساتھ لپیٹ سکتے ہو پر اس کا کیا ہو کہ تم اڑ نہیں سکتے"۔
تو اس پر سانپ بھنا گیا۔ اور جب وہ مڑا اور سوراخ میں داخل ہوا۔ تو
اس نے بڑبڑا کر کہا "خالی الذہن گانے والا پرندہ"۔
اور چنڈول یہ نغمہ سرائی کرتا ہوا محو پرواز ہو گیا۔ "افسوس۔ افسوس میرے
عقلمند دوست تم اڑ نہیں سکتے"۔

قدریں

ایک مرتبہ ایک شخص کو اپنے کھیت میں سے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت مجسمہ ملا۔ وہ اسے کباڑی کے پاس لے گیا۔ جسے تمام خوبصورت اور پرانی چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس شخص نے مجسمہ کو خرید کے لئے پیش کیا۔ کباڑی نے اسے بھاری رقم پر خرید لیا۔ وہ شخص رقم لے کر چلا گیا۔

جب وہ رقم لے کر گھر واپس جا رہا تھا تو اس نے سوچا اور اپنے آپ سے کہا، اس دولت میں کیسی زندگی مضمر ہے، اور ایک پتھر کے بے جان مجسمہ کے عوض میں جو ہزاروں سالوں سے زمین کے نیچے دبا پڑا رہا ہو، اور جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا ہو۔ کوئی اتنی بڑی رقم کیسے دے سکتا ہے

اب کباڑی اس خوبصورت مجسمے کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا اور

اس نے اپنے آپ سے کہا۔ کتنا حسین ہے، کیا زندگی ہے، کسی روح کا خواب ہے، اور ہزارہا سال کی میٹھی نیند نے اس میں کیا تازگی بھردی ہے اور کوئی شخص ایسی خوبصورت چیز کو بے جان اور بے حس دولت کے عوض کیونکر فروخت کر سکتا۔

دوسرے سمندر

ایک مچھلی نے دوسری مچھلی سے کہا۔ "ہمارے اس سمندر کے اوپر ایک اور سمندر ہے، جسمیں اور جاندار بھی تیر رہے ہیں۔ اور وہ بالکل ایسے ہی رہتے ہیں جس طرح کہ ہم یہاں بسر کر رہے ہیں۔"

دوسری مچھلی نے جواب دیا۔ "وہم، نرا وہم، تم جانتی ہو۔ کہ جو چیز ہمارے سمندر سے ایک انچ بھی پرے ہٹ جاتی ہے، اور وہیں ٹھہرتی ہے، تو وہ مرجاتی ہے۔ تمہارے پاس دوسری زندگیوں کا دوسرے سمندروں میں زندہ رہنے کا کیا ثبوت ہے۔"

پچھتاوا

ایک تاریک رات میں ایک شخص اپنے ہمسائے کے باغ میں داخل ہوا اور اپنی دانست میں سب سے بڑا تربوز چرایا۔ اور اُسے گھر لے آیا۔

جب اس نے اسے چیرا۔ تو دیکھا۔ کہ وہ ابھی کچّا ہی تھا۔

تب ایک معجزہ رونما ہوا۔

اس شخص کا ضمیر بیدار ہوا اور اسے ندامت سے جلانے لگا اور وہ تربوز چرانے پر پچھتایا۔"

قریب المرگ انسان اور گدھ

ٹھہرو —— ابھی ذرا ٹھہرو —— میرے مشتاق دوست

میں بہت جلد اس فانی جسم کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔

جس کا درد و کرب میرے رگ و ریشہ میں سما کر بیکار ہو چکا ہے۔

اور جسے دیکھ کر تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ ان لمحوں میں تمہاری سچی خواہش کو منتظر

رکھوں۔

لیکن یہ زنجیر حیات

گو یہ سانس کی بنی ہوئی ہے۔

پھر بھی مشکل سے ٹوٹتی ہے

اور مرنے کی تمنا۔

جو تمام مضبوط ترین چیزوں سے مضبوط ہے۔

زندہ رہنے کی تمنا سے رکی ہوئی ہے

جو تمام ناتواں چیزوں سے سست ہے

مجھے معاف کرنا میرے رفیق ——— میں بہت پیچھے

رہ گیا ہوں۔

یہ میری یاد ہے۔ جو میری روح کو روکے ہوئے ہے۔

گزرے ہوئے دنوں کا جلوس۔

خواب میں گزری ہوئی جوانی کی ایک جھلک

ایک چہرہ جو میری پلکوں کو محو خواب ہونے سے روکتا ہے۔

ایک آواز جو میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

ایک ہاتھ جو میرے ہاتھ کو چھو رہا ہے۔

مجھے معاف کرنا تمہیں بہت دیر انتظار میں رکھا۔

اب یہ قصہ پاک ہو گیا ہے۔

تمام چیزیں مجھ سے روپوش ہو چکی ہیں۔

چہرہ ــــ آواز ــــ ہاتھ اور وہ دھند جو انہیں یہاں
لائی تھی۔
گرہ کُھل گئی ہے
ڈوری بکھر چکی ہے۔
اور وہ چیز جو نہ غذا ہے اور نہ پانی واپس لی جا چکی
ہے
آؤ ــــ میرے نزدیک آؤ، میرے بھُوکے رفیق۔
کھانا چنا جا چکا ہے۔
اور یہ کفایت شعارانہ تقریب محبّت سے دی گئی ہے۔
آؤ ــــ اور یہاں اپنی چونچ گاڑ دو۔
میرے بائیں پہلو میں۔
اور اس چھوٹے سے پرندے کو اس کے قفس سے آزاد کر دو۔
جس کے پر اب کبھی پھڑپھڑا نہیں سکتے۔
میری خواہش ہے۔ کہ یہ تمہارے ساتھ آسمان کی طرف اُڑ
جائے۔

اب آؤ —— ہاں آؤ —— میرے دوست!

میں آج کی رات تمہارا میزباں ہوں۔

اور تم ——!

تم میرے معزز مہماں!

میری خلوت سے پرے

میری خلوت سے پرے ایک اور خلوت ہے۔ اور اس خلوت میں بسنے والا میری تنہائی کو ایک بارونق منڈی اور میری خاموشی کو منتشر آوازوں کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے۔

میں اتنا کم سن اور بے چین ہوں۔ کہ عالم بالا کی اس خلوت تک پہنچ نہیں سکتا۔ اس وادی کی صدائیں میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہی ہیں اور اس کے سائے میری راہ روکے کھڑے ہیں لیکن میں جا نہیں سکتا۔

ان پہاڑیوں سے پرے جادو کا ایک جنگل ہے۔ اور اس کا باسی طلسم ہوشربا ہے اس کے سامنے میرا سکون قلب ایک آندھی کی مانند ہے اور میری دلفریبی ایک دھوکا ہے

میں ابھی کمسن ہوں، اور میری ہنگامہ پسندی مجھے اس مقدس کنج تک پہنچنے نہیں دیتی۔

میرے ہونٹوں سے ابھی خون لگا ہے۔ اور میرے بزرگوں کی کمان اور تیر ابھی تک میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں جا نہیں سکتا۔

میرے اس گرانبار عنصر سے پرے میرا آزاد عنصر ہے جس کی روشنی میں میرے خواب بہر سے بیکار ہیں اور میری امیدوں کی ہڈیاں کھڑکھڑا رہی ہیں۔

میں ابھی کم سن ہوں۔ اور اس آزاد عنصر تک پہنچنے کیلئے بہت رسوا کیا گیا ہوں۔

اور میں آزاد عنصر کیوں کر بن سکتا ہوں جب تک کہ میں اپنے محکوم عنصر کو ہلاک نہ کر دوں یا جب تک کہ تمام لوگ آزاد نہ ہو جائیں۔

میری نغمہ سنج پتیاں ہواؤں میں کیوں کر پرواز کر سکتی ہیں تاوقتیکہ میری جڑیں اندھیرے میں پژمردہ نہ ہو جائیں۔

میرا شاہین آفتاب کی بلندی تک کیونکر پہنچ سکتا ہے جبتک

کہ میرے چھوٹے بچے اس آشیاں کو خیرباد نہ کہہ دیں جسے میں نے اپنی چونچ میں تنکے اٹھا کر بنایا ہے۔

آخری پہر

بہت رات گزرے۔ جب صبح کی پہلی کرن نے ہوا پر سانس لیا۔

پیش رو،
جو اپنے آپ کو ایک ان سنی آواز کی صدائے بازگشت کہتا ہے اپنی
خواب گاہ سے نکل کر اپنے مکان کی چھت پر چلا گیا۔ وہ چھت پر کافی دیر
تک ساکت کھڑا رہا اور سوئے ہوئے شہر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس
نے اپنا سر اٹھایا۔ گویا سونے والوں کی بیدار روحیں اس کے گرد
جمع ہو گئی ہوں۔ اور اس نے اپنے لب کھولے اور بولا۔

میرے دوستو اور میرے ہمسایو اور تم جو روزانہ میرے دروازے سے
گزرتے ہو۔

میں تم سے سوتے میں مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔
میں تمہارے خوابوں کی وادی میں بے کھٹکے اور ننھا پھروں گا۔
کیونکہ تم بیداری کے عالم میں غافل ہو۔ اور تمہارے صداؤں سے گراں بار
کان بہرے ہیں۔

میں نے مدتوں تم سے محبت کی اور خوب کی۔
میں نے تم میں سے ایک ایک کے ساتھ اس طرح محبت کی گویا وہ
ایک سب کچھ ہے۔ اور سب سے اس طرح محبت کی، گویا وہ سب
ایک ہیں۔ اور میں اپنے دل کی فصل بہار میں تمہارے باغوں میں
گایا کیا۔ اور جب دل کا موسم گرما آیا۔ تو میں تمہارے خرمنوں کو
دیکھا کیا۔

مجھے تم سب سے محبت تھی ہاں مجھے تم سب سے محبت ہے۔
قوی ہیکل ——— بالشتئے ——— کوڑھی ———
مقدس پیشوا ———

اور اس سے بھی جو پہاڑوں پر ناچ کر اپنے دن گزار دیتا ہے۔
تم توانا ؤ ——— !

میں نے تم سے محبّت کی۔ گو تمہارے آہنی سموں کے نشان میری جلد
پر بدستور نقش ہیں۔

اور تم ناتوانو ——— !

میں نے تم سے بھی محبت کی۔ گو تم نے میرا عقیدہ مجھ سے چھین لیا۔
اور میرا صبر و تحمل اکارت گیا۔

اور تم مالدارو ——— !

میں نے تم سے پیار کیا۔ گو تمہارے شہد کا ذائقہ میرے منہ میں
تلخ ہو گیا۔

اور تم نادارو ——— !

میں نے تم سے بھی محبت کی۔ گو تم میرے خالی ہاتھ کی شرم
جانتے تھے۔

تم شاعرو ——— !

بھدی بانسری اور اندھی انگلیوں والے شاعرو ——— !!

میں نے اپنی نفس پرستی کی خاطر تم سے بھی محبت کی۔

اور تم عالمو ——— !

میں نے تم سے بھی پیار کیا۔ جو ہمیشہ ان میدانوں میں جہاں سے کوزہ گر مٹی لاتے ہیں۔ بوسیدہ کفن جمع کرتے رہے ہو۔

تم مذہبی پیشواؤ ــــ!

میں نے تم سے محبت کی۔ جو دیدہ وزر کی خاموشیوں میں بیٹھ کر فرد اکی قسمت کا جائزہ لیتے رہتے ہو۔

اور تم دیوتاؤں کے پوجنے والو! یہ دیوتا خود تمہاری اپنی خواہشیں ہیں۔ میں نے تم سے بھی محبّت کی۔

اور اے پیاسی عورت ــــ!

جس کا جام ہمیشہ لبریز رہا۔ میں نے تمہاری فطرت کو پہچانا اور تم سے پیار کیا

اور اسے بے چین راتوں والی عورت!

میں نے تم پر رحم کھا کر تم سے محبت کی!

تم باتونیو ــــ!

مَیں نے تم سے یہ کہتے ہوئے محبّت کی۔ کہ زندگی کو اپنے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔

اور تم گونگو ——— !

میں نے تم سے اپنی دبی زبان میں یہ کہتے ہوئے محبّت کی۔ کہ اس
خاموشی میں وہ کچھ نہیں کہتا جو میں لفظوں میں سننا چاہتا ہوں۔

اور اے منصفو اور نقادو۔

میں نے تم سے بھی محبت کی۔ حالانکہ جب تم نے مجھے سولی پر چڑھتے
دیکھا۔ تو تم نے کہا۔ دیکھو اس کا خون کتنے ترنم سے بہہ رہا ہے۔ اور
اس کی سفید جلد پر خون کا نشان کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اے جوانو اور بوڑھو !

بید مجنوں اور شاہ بلوط کے درختو۔

میں نے تم سے محبت کی ——— لیکن وا حسرتا تم
نے میرے دل میں محبت کی فراوانی دیکھ کر مجھ سے منہ چھپا
لیا۔

تم ایک پیالے میں سے محبت کے گھونٹ پینا چاہتے ہو لیکن
ایک متلاطم دریا سے سیر ہونا نہیں چاہتے۔

تم محبت کی خفیف صدا سننے کے خواہشمند ہو۔

لیکن جب محبت نعرہ لگاتی ہے۔ تو تم اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہو۔

اور چونکہ مجھے تم سے محبت تھی، تم نے کہا۔ اس کا دل بہت ہی نرم اور درد آشنا ہے۔ اور یہ شخص دیکھ بھال کر رستے پر نہیں چلتا۔

یہ ایک محتاج کی محبت ہے۔ جو شاہانہ ضیافتوں میں شریک ہوتا ہوا بھی روٹی کے ٹکڑے چنتا ہے۔

یہ ایک کمزور کی محبت ہے۔ کیونکہ طاقتور ہمیشہ طاقتوروں سے محبت کرتا ہے۔

اور چونکہ تم سے مجھے بے پایاں محبت تھی، تم نے کہا، یہ ایک اندھے شخص کی محبت ہے جسے نہ تو کسی کے حسن کا علم ہے اور نہ کسی کی بدصورتی کا احساس ہے۔

اور یہ ایسے بد ذوق کی محبت ہے جو سرکے کو شراب کی طرح پی جاتا ہے۔

اور یہ ایک گستاخ اور خود پسند کی محبت ہے۔

آخر ایک اجنبی سے ماں اور باپ ——— بہن اور بھائی کا رشتہ
کیونکر ہو سکتا ہے۔

تم نے یہ اور بہت سی دوسری باتیں بھی کہیں منڈلی میں بارہا تمہاری انگلیاں میری جانب اٹھیں اور تم نے طنزیہ پیرائے میں کہا۔ دیکھو وہ جاتا ہے سدا جوان اور بے رتا انسان، جو عین دوپہر کے وقت ہمارے بچوں سے کھیل کھیلتا ہے۔ اور شام کو ہمارے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر دانشمندی اور فہم و ذکاوت کا روپ دھار لیتا ہے۔

اور میں نے کہا۔ میں انہیں سب سے زیادہ پیار کروں گا۔

ہاں بہت زیادہ۔

میں اپنی محبت کو ظاہری نفرت میں چھپا لوں گا۔ اور اپنے نرم جذبات پر تلخی کا پردہ ڈال لوں گا۔

میں آہنی نقاب پہن لوں گا اور ان سے مسلح ہو کر اور ذرہ بکتر لگا کر ملوں گا۔

پھر میں نے تمہارے زخموں پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔ اور رات

کے طوفان کی مانند میں تمہارے کانوں میں گرجا۔

مکان کی چھت پر سے میں نے اعلان کیا۔ کہ تم گندم نما جو فروش ہو۔

غلط منطقی ——— فریب کار ——— جھوٹے اور خالی زمین کے بلبلے ہو۔

تم میں سے جو کوتاہ اندیش ہیں۔ میں نے انہیں اندھے چمگادڑ کہہ کر بد دُعا دی۔

اور جو دنیاوی مفاد سے زیادہ گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں بے روح چھچھوندر کہا۔

اور تم میں جو فصیح باتیں کرتے تھے۔ انہیں کانٹے دار زبانیں کہا۔

اور جو پتھریلے لبوں والے سادہ لوح اور بے سلیقہ لوگ ہیں میں نے کہا یہ مردہ ہیں۔ اور یہ بار بار مرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔

اور جو دنیوی علم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ میں نے انہیں مقدس روح کا باغی قرار دیا۔

اور وہ جو رنج سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں سائے کے
شکاری کہا۔
اور وہ جو اپنے جال پایاب پانیوں میں ڈالتے ہیں۔ اپنے سائے
کے سوا کچھ نہیں شکار کرتے۔
اس طرح میرے ہونٹوں نے بظاہر تمہیں مطعون کیا لیکن میرا دل
خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اور اس نے تمہیں محبت آمیز ناموں سے پکارا۔
یہ محبت ہی تو تھی۔ جو اپنے ہی عنصر سے ضربیں کھا کر بول رہی
تھی۔
یہ غرور تھا۔ جو نیم بسمل ہو کر خاک میں تڑپ رہا تھا۔
یہ تمہاری محبت کے لئے میری بھوک ہی تو تھی۔ جو چھت پر جوش
میں تھی جبکہ میری اپنی محبت خاموشی میں دو زانو ہو کر تم سے معافیاں
مانگ رہی تھی۔
لیکن وہ دیکھو معجزہ!
یہ میرا بہروپ تھا جس نے تمہاری آنکھیں کھول دیں اور بظاہر میری
نفرت نے تمہارے دلوں کے دروازے وا کر دیئے۔

اور اب تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔

تم ان تلواروں کو پوجتے ہو، جو تمہیں کاٹتی ہیں۔

اور ان تیروں کو چومتے ہو جو تمہارے سینوں میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ زخمی ہو کر تم مطمئن ہو جاتے ہو اور جب تم نے اپنا ہی لہو پیا ہو تو تمہیں نشہ ہو جاتا ہے۔

ان پروانوں کی طرح جو شعلے پر مر مٹنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں تم میرے باغ میں ہر روز جمع ہوتے ہو۔ اور اپنی قسمت کے جامے کو تار تار ہوتے دیکھ کر اپنے متحیر چہرے اٹھا کر اور سحر زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہو اور دبی زبان سے ایک دوسرے کو کہتے ہو۔

اس میں خدائی نور دکھائی پڑتا ہے اور اس کے کلام میں انبیائے قدیم کے پیغامبروں ایسی تاثیر ہے۔ اس نے ہماری روحوں کو بے نقاب کر دیا ہے، اور ہمارے دلوں کے قفل توڑ ڈالے ہیں۔ اور اس عقاب کی طرح جو لومڑوں کے طور طریقوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے سب ڈھنگ معلوم ہیں۔

ہاں سچ تو یہ ہے میں تمہارے طور طریق جانتا ہوں۔ لیکن ایسے

جیسے عقاب اپنے بچّوں کی حرکات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ اور میں اپنے راز کھول دینا چاہتا ہوں۔ لیکن میں اپنی ضرورت میں تمہارے نزدیک رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری قربت مرغوب ہے۔ مگر میں دُور دُور رہنے کا بہانہ کرتا ہوں۔

میں تمہاری محبّت کے مدوجزر سے واقف ہوں۔ پھر بھی میں اپنی محبت کے طوفان کی نگہبانی کرتا ہوں۔

یہ کہہ چکنے کے بعد پیش رو نے اپنے چہرے کو اپنے دونو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور زار زار رو دیا۔ کیونکہ وہ اپنے دل میں جانتا تھا۔ کہ جو محبّت عریاں ہو کر رسوا ہو جائے۔ اس کا مرتبہ اس محبت سے بہت بلند ہوتا ہے۔ جو چھپ چھپا کر کامرانی سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے اور وہ شرمسار ہو گیا۔

لیکن یکایک اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور جیسے کوئی خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور کہا۔

رات ختم ہوئی ——— ہم رات کے بچے مر جائیں گے۔

جب صبح صادق کی روشنی پہاڑیوں پر اچھلتی ہوئی آئے گی

تو ہماری ہی راکھ میں سے ایک عظیم تر محبت پیدا ہو گی وہ محبت سورج پر قہقہہ زن ہونے والی محبت ہو گی ——— اور لافانی۔